© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تفہیم القرآن

الذّاریات

نام پہلے ہی لفظ وَالذّٰرِیٰتِ سے ماخوذ ہے۔ مُراد یہ ہے کہ وہ سُورۃ جس کی ابتدا لفظ الذّاریات سے ہوتی ہے۔

زمانۂ نزول مضامین اور اندازِ بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کا مقابلہ تکذیب و استہزاء اور جھوٹے الزامات سے تو بڑے زور شور کے ساتھ ہو رہا تھا، مگر ابھی ظلم و تشدد کی چکّی چلنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے یہ بھی اُسی دور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہے جس میں سورۃ ق نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مباحث اس کا بڑا حصہ آخرت کے موضوع پر ہے، اور آخر میں توحید کی دعوت پیش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کو اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی بات نہ ماننا اور اپنے جاہلانہ تصورات پر اصرار کرنا خود انہی قوموں کے لیے تباہ کُن ثابت ہوُا ہے جنہوں نے یہ روش اختیار کی ہے۔

آخرت کے متعلق جو بات اس سورہ کے چھوٹے چھوٹے مگر نہایت پُرمعنی فقروں میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے مآل و انجام کے بارے میں لوگوں کے مختلف اور متضاد عقیدے خود اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ ان میں سے کوئی عقیدہ بھی علم پر مبنی نہیں ہے بلکہ ہر ایک نے قیاسات دوڑا کر اپنی جگہ جو نظریہ قائم کر لیا اسی کو وہ اپنا عقیدہ بنا کر بیٹھ گیا۔ کسی نے سمجھا کہ زندگی بعد موت نہیں ہوگی۔ کسی نے اس کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مانا تو تناسخ کی شکل میں مانا۔ کسی نے حیاتِ اُخروی اور جزا و سزا کو تسلیم کیا تو جزائے اعمال سے بچنے کے لیے طرح طرح کے سہارے تجویز کر لیے۔ اتنے بڑے اور اہم ترین بنیادی مسئلے پر، جس کے بارے میں آدمی کی رائے کا غلط ہو جانا اُس کی پُوری زندگی کو غلط کر کے رکھ دیتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے مستقبل کو برباد کر ڈالتا ہے، علم کے بغیر محض قیاسات کی بنا پر کوئی عقیدہ بنا لینا ایک تباہ کُن حماقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہ کر ساری عمر جاہلانہ غفلت میں گزار دے اور مرنے کے بعد اچانک ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جس کے لیے اس نے قطعاً کوئی تیاری نہ کی تھی۔ ایسے مسئلے کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا بس ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کو آخرت کے متعلق جو علم خدا کی طرف سے اُس کا نبی دے رہا ہے اُس پر وہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرے اور زمین و آسمان کے نظام اور خود اپنے وجود پر نگاہ ڈال کر کھلی آنکھوں سے دیکھے کہ کیا اُس علم کے صحیح ہونے کی شہادت ہر طرف موجود نہیں ہے؟ اس سلسلے میں ہوا اور بارش کے انتظام کو، زمین کی ساخت اور اس کی مخلوقات کو، انسان کے اپنے نفس کو، آسمان کی تخلیق کو، اور دنیا کی تمام اشیاء کے جوڑوں کی شکل میں بنائے جانے کو آخرت کی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور انسانی تاریخ سے مثالیں دے کر بتایا گیا ہے کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کس طرح ایک قانونِ مکافات کا مقتضی نظر آ رہا ہے۔

اس کے بعد بڑے مختصر انداز میں توحید کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تمہارے خالق نے تم کو دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ تمہارے بناوٹی معبودوں کی طرح نہیں ہے جو تم سے رزق لیتے ہیں اور تمہاری مدد کے بغیر جن کی خدائی نہیں چل سکتی۔ وہ ایسا معبود ہے جو سب کا رزّاق ہے، کسی سے رزق لینے کا محتاج نہیں، اور جس کی خدائی خود اُس کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ جب بھی کیا گیا ہے کسی معقول بنیاد پر نہیں بلکہ اُسی ضد اور ہٹ دھرمی اور جاہلانہ غرور کی بنیاد پر کیا گیا ہے جو آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برتی جا رہی ہے، اور اس کی محرک بجز سرکشی کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ ان سرکشوں کی طرف التفات نہ کریں اور اپنی دعوت و تذکیر کا کام کیے جائیں، کیونکہ وہ اِن لوگوں کے لیے چاہے نافع نہ ہو مگر ایمان لانے والوں کے لیے نافع ہے۔ رہے وہ ظالم جو اپنی سرکشی پر مصر ہیں، تو ان سے پہلے اسی روش پر چلنے والے اپنے حصے کا عذاب پا چکے ہیں اور اِن کے حصے کا عذاب تیار ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

قسم ہے اُن ہواؤں کی جو گرد اڑانے والی ہیں، پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھانے والی ہیں[1]، پھر سبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی ہیں، پھر ایک بڑے کام (بارش) کی تقسیم کرنے والی ہیں[2]،

---

[1] اس امر پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ الذّاریات سے مراد پراگندہ کرنے والی اور گرد و غبار اٹھانے والی ہوائیں ہیں، اور الحَامِلاَتِ وِقْرًا (بھاری بوجھ اٹھانے والیوں) سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو سمندروں سے لاکھوں کروڑوں گیلن پانی کے بخارات بادلوں کی شکل میں اٹھا لیتی ہیں۔ یہی تفسیر حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور مجاہد، سعید بن جبیر، حسن بصری، قتادہ اور سُدّی وغیرہ حضرات سے منقول ہے۔

[2] الجَارِیَاتِ یُسْرًا اور المُقَسِّمَاتِ اَمْرًا کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے، یا یہ مفہوم لینا جائز رکھا ہے کہ ان دونوں سے مراد بھی ہوائیں ہی ہیں، یعنی یہی ہوائیں پھر بادلوں کو لے کر چلتی ہیں اور پھر روئے زمین کے مختلف حصوں میں پھیل کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق، جہاں جتنا حکم ہوتا ہے، پانی تقسیم کرتی ہیں۔ دوسرے گروہ نے الجَارِیَاتِ یُسْرًا سے مراد سبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی کشتیاں لی ہیں اور المُقَسِّمَاتِ اَمْرًا سے مراد وہ فرشتے لیے ہیں جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جا رہا ہے[۳] وہ سچّی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آنی ہے[۴]۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اُس کی مخلوقات کے نصیب کی چیزیں اُن میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک روایت کی رُو سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں فقروں کا یہ مطلب بیان کرکے فرمایا کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سُنا ہوتا تو میں اسے بیان نہ کرتا۔ اسی بنا پر علامہ آلوسی اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کے سوا اِن فقروں کا کوئی اور مطلب لینا جائز نہیں ہے اور جن لوگوں نے کوئی دوسرا مفہوم لیا ہے انھوں نے بے جا جسارت کی ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند ضعیف ہے اور اس کی بنیاد پر قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع حضورؐ ہی نے اِن فقروں کی یہ تفسیر فرمائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحابہ و تابعین کی ایک معتد بہ جماعت سے یہی دوسری تفسیر منقول ہے لیکن مفسرین کی ایک اچھی خاصی جماعت نے پہلی تفسیر بھی بیان کی ہے اور سلسلۂ کلام سے وہ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب اور مولانا محمود الحسن صاحب نے بھی اپنے ترجموں میں پہلا مفہوم ہی لیا ہے۔

[۳] اصل میں لفظ تُوْعَدُوْنَ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اگر وَعْد سے ہو تو اس کا مطلب ہوگا "جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے"، اور وَعِید سے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ "جس چیز کا تم کو ڈراوا دیا جا رہا ہے"۔ زبان کے لحاظ سے دونوں مطلب یکساں درست ہیں لیکن موقع و محل کے ساتھ دوسرا مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو کفر و شرک اور فسق و فجور میں غرق تھے اور یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کبھی ان کو محاسبے اور جزائے اعمال سے بھی سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اسی لیے ہم نے تُوْعَدُوْنَ کو وعدے کے بجائے وعید کے معنی میں لیا ہے۔

[۴] یہ ہے وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے۔ اس قسم کا مطلب یہ ہے کہ جس بے نظیر نظم اور باقاعدگی کے ساتھ بارش کا یہ عظیم الشان ضابطہ تمہاری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، اور جو حکمت اور مصلحتیں اس میں صریح طور پر کار فرما نظر آتی ہیں، وہ اس بات پر گواہی دے رہی ہیں کہ یہ دنیا کوئی بے مقصد اور بے معنی گھروندا نہیں ہے جس میں لاکھوں کروڑوں برس سے ایک بہت بڑا کھیل بس یونہی الل ٹپ ہوتے جا رہا ہو، بلکہ یہ درحقیقت ایک کمال درجے کا حکیمانہ نظام ہے جس میں ہر کام کسی مقصد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کسی مصلحت کے لیے ہو رہا ہے۔ اِس نظام میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ یہاں انسان جیسی ایک مخلوق کو عقل، شعور، تمیز اور تصرف کے اختیارات دے کر، اس میں نیکی و بدی کی اخلاقی حِس پیدا کرکے اور اسے ہر طرح کے اچھے اور بُرے، صحیح اور غلط کاموں کے مواقع دے کر، زمین میں تُرکتازیاں کرنے کے لیے محض فضول اور لایعنی طریقے سے چھوڑ دیا جائے، اور اس سے کبھی یہ بازپرس نہ ہو کہ دل و دماغ اور جسم کی جو قوتیں اس کو دی گئی تھیں، دنیا میں کام کرنے کے لیے جو وسیع ذرائع اس کے حوالے کیے گئے تھے، اور خدا کی بے شمار مخلوقات پر تصرف کے جو اختیارات اُسے دیئے گئے تھے، اُن کو اُس نے کس طرح استعمال کیا۔ جس نظامِ کائنات میں سب کچھ بامقصد ہے، اس میں صرف انسان جیسی عظیم مخلوق کی تخلیق کیسے بے مقصد ہو سکتی ہے۔ جس نظام میں ہر چیز مبنی بر حکمت ہے اس میں تنہا ایک انسان ہی کی تخلیق کیسے فضول اور عبث ہو سکتی ہے۔ مخلوقات کی جو اقسام عقل و شعور نہیں رکھتیں ان کی تخلیق کی مصلحت تو اِسی عالمِ طبیعی میں پُوری ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر وہ اپنی مدتِ عمر ختم ہونے کے بعد ضائع کر دی جائیں تو یہ عین معقول بات ہے، کیونکہ انہیں کوئی اختیارات دیئے ہی نہیں گئے ہیں کہ ان سے محاسبے کا کوئی سوال پیدا ہو۔ مگر عقل و شعور اور اختیارات رکھنے والی مخلوق، جس کے افعال محض عالمِ طبیعت تک محدود نہیں ہیں بلکہ اخلاقی نوعیت بھی رکھتے ہیں، اور جس کے اخلاقی نتائج پیدا کرنے والے اعمال کا سلسلہ محض زندگی کی آخری ساعت تک ہی نہیں چلتا بلکہ مرنے کے بعد بھی اُس پر اخلاقی نتائج مترتب ہوتے رہتے ہیں، اسے صرف اُس کا طبیعی کام ختم ہو جانے کے بعد نباتات و حیوانات کی طرح کیسے ضائع کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے تو اپنے اختیار و ارادہ سے جو نیکی یا بدی کی ہے اس کی ٹھیک ٹھیک مبنی بر حق و انصاف جزا اس کو لازماً ملنی ہی چاہیے، کیونکہ یہ اُس مصلحت کا بنیادی تقاضا ہے جس کے تحت دوسری مخلوقات کے برعکس اس کو ایک ذی اختیار مخلوق بنایا گیا ہے۔ اُس سے محاسبہ نہ ہو، اس کے اخلاقی اعمال پر جزا و سزا نہ ہو، اور اس کو بھی بے اختیار مخلوقات کی طرح عمرِ طبیعی ختم ہونے پر ضائع کر دیا جائے، تو لامحالہ اس کی تخلیق سراسر عبث ہو گی، اور ایک حکیم سے فعلِ عبث کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قسم ہے متفرق شکلوں والے آسمان کی شے (آخرت کے بارے میں) تمہاری بات ایک دوسرے

اِس کے علاوہ آخرت اور جزا و سزا کے وقوع پر اِن چار مظاہر کائنات کی قسم کھانے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ منکرینِ آخرت زندگی بعدِ موت کو جس بنا پر غیر ممکن سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم جب مر کر خاک میں رل مِل جائیں گے اور ہمارا ذرہ ذرہ جب زمین میں منتشر ہوجائے گا تو کیسے ممکن ہے کہ یہ سارے منتشر اجزائے جسم پھر اکٹھے ہوجائیں اور ہمیں دوبارہ بنا کھڑا کیا جائے۔ اس شبہ کی غلطی اُن چاروں مظاہرِ کائنات پر غور کرنے سے خود بخود رفع ہوجاتی ہے جنہیں آخرت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورج کی شعاعیں روئے زمین کے اُن تمام ذخائرِ آب پر اثر انداز ہوتی ہیں جن تک ان کی حرارت پہنچتی ہے۔ اس عمل سے پانی کے بے حد و حساب قطرے اڑ جاتے ہیں اور اپنے مخزن میں باقی نہیں رہتے۔ مگر وہ فنا نہیں ہوجاتے بلکہ بھاپ بن کر ایک ایک قطرہ ہوا میں محفوظ رہتا ہے۔ پھر جب خدا کا حکم ہوتا ہے تو یہی ہوا اُن قطروں کی بھاپ کو سمیٹ لاتی ہے، اس کو کثیف بادلوں کی شکل میں جمع کرتی ہے، ان بادلوں کو لے کر روئے زمین کے مختلف حصوں میں پھیل جاتی ہے، اور خدا کی طرف سے جو وقت مقرر ہے ٹھیک اُسی وقت ایک ایک قطرے کو اُسی شکل میں جس میں وہ پہلے تھا، زمین پر واپس پہنچا دیتی ہے۔ یہ منظر جو آئے دن انسان کی آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہے، اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مرے ہوئے انسانوں کے اجزائے جسم بھی اللہ تعالیٰ کے ایک اشارے پر جمع ہوسکتے ہیں اور ان انسانوں کو اسی شکل میں پھر اٹھا کھڑا کیا جاسکتا ہے جس میں وہ پہلے موجود تھے۔ یہ اجزا خواہ مٹی میں ہوں، یا پانی میں، یا ہوا میں، بہرحال رہتے اِسی زمین اور اس کے ماحول ہی میں ہیں۔ جو خدا پانی کے بخارات کو ہوا میں منتشر ہوجانے کے بعد پھر اُسی ہوا کے ذریعہ سے سمیٹ لاتا ہے اور انہیں پھر پانی کی شکل میں برسا دیتا ہے، اس کے لیے انسانی جسموں کے بکھرے ہوئے اجزاء کو ہوا، پانی اور مٹی میں سے سمیٹ لانا اور پھر سابق شکلوں میں جمع کر دینا آخر کیوں مشکل ہو؟

شے اصل میں لفظ ذات الحُبُک استعمال ہوا ہے۔ حُبُک راستوں کو بھی کہتے ہیں۔ اُن لہروں کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مختلف ہے۶۔ اُس سے وہی برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پھرا ہوا ہے۷۔

بھی کہتے ہیں جو ہوا کے چلنے سے ریگستان کی ریت اور ٹھہرے ہوئے پانی میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور گھونگھر والے بالوں میں جو لٹیں سی بن جاتی ہیں اُن کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ یہاں آسمان کو حُبُک والا یا تو اس لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ آسمان پر اکثر طرح طرح کی شکلوں والے بادل چھائے رہتے ہیں جن میں ہوا کے اثر سے بار بار تغیر ہوتا ہے اور کبھی کوئی شکل نہ خود قائم رہتی ہے، نہ کسی دوسری شکل سے مشابہ ہوتی ہے۔ یا اس بنا پر فرمایا گیا ہے کہ رات کے وقت آسمان پر جب تارے بکھرے ہوتے ہیں تو آدمی دیکھتا ہے کہ ان کی بہت سی مختلف شکلیں ہیں اور کوئی شکل دوسری شکل سے نہیں ملتی۔

۶ ؎ اِس اختلافِ اقوال پر متفرق شکلوں والے آسمان کی قَسم تشبیہ کے طور پر کھائی گئی ہے۔ یعنی جس طرح آسمان کے بادلوں اور تاروں کے جُھرمٹوں کی شکلیں مختلف ہیں اور ان میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی، اسی طرح آخرت کے متعلق تم لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہو اور ہر ایک کی بات دوسرے سے مختلف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ دنیا ازلی و ابدی ہے اور کوئی قیامت برپا نہیں ہو سکتی۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ نظام حادث ہے اور ایک وقت میں یہ جا کر ختم بھی ہو سکتا ہے، مگر انسان سمیت جو چیز بھی فنا ہو گئی پھر اس کا اعادہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی اعادے کو ممکن مانتا ہے، مگر اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کے اچھے اور بُرے نتائج بھگتنے کے لیے بار بار اسی دنیا میں جنم لیتا ہے۔ کوئی جنت اور جہنم کا بھی قائل ہے، مگر اس کے ساتھ تناسُخ کو بھی ملاتا ہے، یعنی اس کا خیال یہ ہے کہ گناہ گار جہنم میں بھی جا کر سزا بھگتتا ہے اور پھر اس دنیا میں بھی سزا پانے کے لیے جنم لیتا رہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا کی زندگی خود ایک عذاب ہے، جب تک انسان کے نفس کو مادی زندگی سے لگاؤ باقی رہتا ہے اُس وقت تک وہ اِس دنیا میں مر مر کر پھر جنم لیتا رہتا ہے، اور اس کی حقیقی نجات (نروان) یہ ہے کہ وہ بالکل فنا ہو جائے۔ کوئی آخرت اور جنت و جہنم کا قائل ہے، مگر کہتا ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو صلیب پر موت دے کر انسان کے ازلی گناہ کا کفارہ ادا کر دیا ہے، اور اُس بیٹے پر ایمان لا کر آدمی اپنے اعمالِ بد کے بُرے نتائج سے بچ جائے گا۔ کچھ دوسرے لوگ آخرت اور جزا و سزا، ہر چیز کو مان کر بعض ایسے بزرگوں کو شفیع تجویز کر لیتے ہیں جو اللہ کے ایسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مارے گئے قیاس و گمان سے حکم لگانے والے، جو جہالت میں غرق اور غفلت میں مدہوش

پیارے ہیں، یا اللہ کے ہاں ایسا زور رکھتے ہیں کہ جو اُن کا دامن گرفتہ ہو وہ دنیا میں سب کچھ کر کے بھی سزا سے بچ سکتا ہے۔ اور ان بزرگ ہستیوں کے بارے میں بھی اِس عقیدے کے ماننے والوں میں اتفاق نہیں ہے، بلکہ ہر ایک گروہ نے اپنے الگ الگ شفیع بنا رکھے ہیں۔ یہ اختلافِ اقوال خود ہی اِس امر کا ثبوت ہے کہ وحی و رسالت سے بے نیاز ہو کر انسان نے اپنے اور اِس دنیا کے انجام پر جب بھی کوئی رائے قائم کی ہے، علم کے بغیر قائم کی ہے۔ ورنہ اگر انسان کے پاس اس معاملہ میں فی الواقع براہِ راست علم کا کوئی ذریعہ ہوتا تو اتنے مختلف اور متضاد عقیدے پیدا نہ ہوتے۔

۵ اصل الفاظ ہیں يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ۔ اس فقرے میں عَنْهُ کی ضمیر کے دو مرجع ہو سکتے ہیں۔ ایک جزائے اعمال۔ دوسرے قولِ مختلف۔ پہلی صورت میں اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ "جزائے اعمال کو تو ضرور پیش آنا ہے، تم لوگ اُس کے بارے میں طرح طرح کے مختلف عقیدے رکھتے ہو، مگر اُس کو ماننے سے وہی شخص برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پھرا ہُوا ہے۔" دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ "اِن مختلف اقوال سے وہی شخص گمراہ ہوتا ہے جو دراصل حق سے برگشتہ ہے۔"

۶ اِن الفاظ میں قرآن مجید ایک اہم حقیقت پر انسان کو متنبہ کر رہا ہے۔ قیاس و گمان کی بنا پر کوئی اندازہ کرنا یا تخمینہ لگانا، دنیوی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں تو کسی حد تک چل سکتا ہے، اگرچہ علم کا قائم مقام پھر بھی نہیں ہو سکتا، لیکن اِتنا بڑا بنیادی مسئلہ کہ ہم اپنی پوری زندگی کے اعمال کے لیے کسی کے سامنے ذمہ دار و جواب دہ ہیں یا نہیں، اور ہیں تو کس کے سامنے، کب اور کیا جوابدہی ہمیں کرنی ہوگی، اور اُس جوابدہی میں کامیابی و ناکامی کے نتائج کیا ہونگے، یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کے متعلق آدمی محض اپنے قیاس و گمان کے مطابق ایک اندازہ قائم کرلے اور پھر اسی جوئے کے داؤں پر اپنا تمام سرمایۂ حیات لگا دے۔ اس لیے کہ یہ اندازہ اگر غلط نکلے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آدمی نے اپنے آپ کو بالکل تباہ و برباد کر لیا۔ مزید براں یہ مسئلہ سرے سے اُن مسائل میں سے ہے ہی نہیں جن کے بارے میں آدمی محض قیاس اور ظن و تخمین سے کوئی صحیح رائے قائم کر سکتا ہو۔ کیونکہ قیاس اُن امور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ پوچھتے ہیں آخر وہ روزِ جزا کب آئے گا؟ وہ اُس روز آئے گا جب یہ لوگ آگ پر تپائے

میں چل سکتا ہے جو انسان کے دائرۂ محسوسات میں شامل ہوں، اور یہ مسئلہ ایسا ہے جس کا کوئی پہلو بھی محسوسات کے دائرے میں نہیں آتا۔ لہٰذا یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے بارے میں کوئی قیاسی اندازہ صحیح ہو سکے۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر آدمی کے لیے اِن ماورائے حس و ادراک مسائل کے بارے میں رائے قائم کرنے کی صحیح صورت کیا ہے، تو اس کا جواب قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ دیا گیا ہے، اور خود اِس سورہ سے بھی یہی جواب مترشح ہوتا ہے کہ انسان براہِ راست خود حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا، حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعہ سے دیتا ہے، اور اُس علم کی صحت کے متعلق آدمی اپنا اطمینان اس طریقہ سے کر سکتا ہے کہ زمین اور آسمان اور خود اس کے اپنے نفس میں جو بے شمار نشانیاں موجود ہیں اُن پر غائر نگاہ ڈال کر دیکھے اور پھر بے لاگ طرز پر سوچے کہ یہ نشانیاں آیا اُس حقیقت کی شہادت دے رہی ہیں جو نبی بیان کر رہا ہے، یا اُن مختلف نظریات کی تائید کرتی ہیں جو دوسرے لوگوں نے اس کے بارے میں پیش کیے ہیں؟ خدا اور آخرت کے متعلق علمی تحقیق کا یہی ایک طریقہ ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ اس سے ہٹ کر جو بھی اپنے قیاسی اندازوں پر چلا وہ مارا گیا۔

۹ یعنی اُنہیں کچھ پتہ نہیں ہے کہ اپنے اِن غلط اندازوں کی وجہ سے وہ کس انجام کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ اِن اندازوں کی بنا پر جو راستہ بھی کسی نے اختیار کیا ہے وہ سیدھا تباہی کی طرف جاتا ہے۔ جو شخص آخرت کا منکر ہے وہ سرے سے کسی جوابدہی کی تیاری ہی نہیں کر رہا ہے اور اس خیال میں مگن ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی، حالانکہ اچانک وہ وقت آجائے گا جب اس کی توقعات کے بالکل خلاف دوسری زندگی میں اُس کی آنکھیں کھلیں گی اور اسے معلوم ہوگا کہ یہاں اس کو اپنے ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی ہے۔ جو شخص اِس خیال میں ساری عمر کھپا رہا ہے کہ مر کر پھر اسی دنیا میں واپس آؤں گا، اُسے مرتے ہی معلوم ہو جائے گا کہ اب واپسی کے سارے دروازے بند ہیں، کسی نئے عمل سے پچھلی زندگی کے اعمال کی تلافی کا اب کوئی موقع نہیں، اور آگے ایک اور زندگی ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے اپنی دنیوی زندگی کے نتائج دیکھنے اور بھگتنے ہیں۔ جو شخص اس امید میں اپنے آپ کو ہلاک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائیں گے۔ [۱۰] (ان سے کہا جائے گا) اب چکھو مزا اپنے فتنے کا،[۱۱] یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی

لیے ڈالتا ہے کہ نفس اور اس کی خواہشات کو جب پوری طرح مار دو نگا تو فنائے محض کی شکل میں مجھے عذابِ ہستی سے نجات مل جائے گی، وہ موت کے دروازے سے گزرتے ہی دیکھ لے گا کہ آگے فنا نہیں بلکہ بقا ہے اور اسے اب اِس امر کی جوابدہی کرنی ہے کہ کیا تجھے وجود کی نعمت اسی لیے دی گئی تھی کہ تو اسے بنانے اور سنوارنے کے بجائے مٹانے میں اپنی ساری محنتیں صرف کر دیتا؟ اسی طرح جو شخص کسی ابن اللہ کے کفارہ بن جانے یا کسی بزرگ ہستی کے شفیع بن جانے پر بھروسہ کر کے عمر بھر خدا کی نافرمانیاں کرتا رہا اُسے خدا کے سامنے پہنچتے ہی پتہ چل جائے گا کہ یہاں نہ کوئی کسی کا کفارہ ادا کرنے والا ہے اور نہ کسی میں یہ طاقت ہے کہ اپنے زور سے یا اپنی محبوبیت کے صدقے میں کسی کو خدا کی پکڑ سے بچا لے۔ پس یہ تمام قیاسی عقیدے درحقیقت ایک افیون ہیں جس کی پینک میں یہ لوگ بے سُدھ پڑے ہوتے ہیں اور انہیں کچھ خبر نہیں ہے کہ خدا اور انبیاء کے دیئے ہوئے صحیح علم کو نظر انداز کر کے اپنی جس جہالت پر یہ مگن ہیں وہ انہیں کدھر لیے جا رہی ہے۔

[۱۰] کفار کا یہ سوال کہ روزِ جزا کب آئے گا؟ علم حاصل کرنے کے لیے نہ تھا بلکہ طعن اور استہزاء کے طور پر تھا، اس لیے اُن کو جواب اِس انداز سے دیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی شخص کو بدکرداریوں سے باز آنے کی نصیحت کرتے ہوئے اس سے کہیں کہ ایک روز ان حرکات کا بُرا نتیجہ دیکھو گے، اور وہ اس پر ایک ٹھٹھا مار کر آپ سے پوچھے کہ حضرت، آخر وہ دن کب آئے گا؟ ظاہر ہے کہ اس کا یہ سوال اُس بُرے انجام کی تاریخ معلوم کرنے کے لیے نہیں بلکہ آپ کی نصیحتوں کا مذاق اڑانے کے لیے ہوگا۔ اس لیے اس کا صحیح جواب یہی ہے کہ وہ اُس روز آئے گا جب تمہاری شامت آئے گی۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ آخرت کے مسئلے پر اگر کوئی منکرِ آخرت سنجیدگی کے ساتھ بحث کر رہا ہو تو وہ اُس کے موافق و مخالف دلائل پر تو بات کر سکتا ہے مگر جب تک اس کا دماغ بالکل ہی خراب نہ ہو چکا ہو، یہ سوال وہ کبھی نہیں کر سکتا کہ بتاؤ، وہ آخرت کس تاریخ کو آئے گی۔ اس کی طرف سے یہ سوال جب بھی ہوگا طنز اور تمسخر کے طور پر ہی ہوگا۔ اس لیے کہ آخرت کے آنے کی تاریخ بیان کرنے اور نہ کرنے کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مچا رہے تھے ۱۲؎ - البتہ متقی لوگ ۱۳؎ اُس روز باغوں اور چشموں میں ہونگے، جو کچھ اُن کا رب انہیں دیگا
اسے خوشی خوشی لے رہے ہونگے ۱۴؎ - وہ اُس دن کے آنے سے پہلے نیکو کار تھے، راتوں کو کم ہی

کوئی اثر بھی اصل بحث پر نہیں پڑتا - کوئی شخص نہ اس بنا پر آخرت کا انکار کرتا ہے کہ اس کی آمد کا سال، مہینہ اور دن نہیں بتایا گیا ہے، اور نہ یہ سُن کر اُس کی آمد کو مان سکتا ہے کہ وہ فلاں سال فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو آئے گی - تاریخ کا تعیّن سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ وہ کسی منکر کو اقرار پر آمادہ کر دے، کیونکہ اس کے بعد پھر یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ دن آنے سے پہلے آخر کیسے یہ یقین کر لیا جائے کہ اس روز واقعی آخرت برپا ہوجائے گی۔

۱۱؎ فتنے کا لفظ یہاں دو معنی دے رہا ہے - ایک معنی یہ ہیں کہ اپنے اِس عذاب کا مزہ چکھو - دوسرے معنی یہ کہ اپنے اُس فتنے کا مزہ چکھو جو تم نے دنیا میں برپا کر رکھا تھا - عربی زبان میں اس لفظ کے اِن دونوں مفہوموں کی یکساں گنجائش ہے۔

۱۲؎ کفار کا یہ پوچھنا کہ "آخر وہ روزِ جزا کب آئے گا" اپنے اندر خود یہ مفہوم رکھتا تھا کہ اس کے آنے میں دیر کیوں لگ رہی ہے؟ جب ہم اُس کا انکار کر رہے ہیں اور اس کے جُھٹلانے کی سزا ہمارے لیے لازم ہوچکی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ اسی لیے جہنم کی آگ میں جب وہ تپ رہے ہونگے اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے - اِس فقرے سے یہ مفہوم آپ سے آپ نکلتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی کہ اس نے تم سے نافرمانی کا ظہور ہوتے ہی تمہیں فوراً نہ پکڑ لیا اور سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے وہ تم کو ایک لمبی مہلت دیتا رہا - مگر تم ایسے احمق تھے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹا یہ مطالبہ کرتے رہے کہ یہ وقت تم پر جلدی لے آیا جائے - اب دیکھ لو کہ وہ کیا چیز تھی جس کے جلدی آجانے کا مطالبہ تم کر رہے تھے۔

۱۳؎ اِس سیاق و سباق میں لفظ متقی صاف طور پر یہ معنی دے رہا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی دی ہوئی خبر پر یقین لا کر آخرت کو مان لیا، اور وہ رویّہ اختیار کر لیا جو حیاتِ اُخروی کی کامیابی کے لیے انہیں بتایا گیا تھا، اور اُس روش سے اجتناب کیا جس کے متعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوتے تھے،[۱۵] پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے،[۱۶] اور اُن کے مالوں میں حق تھا سائل

اُنہیں بتا دیا گیا تھا کہ یہ خُدا کے عذاب میں مبتلا کرنے والی ہے۔

۱۴؎ اگرچہ اصل الفاظ ہیں اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰھُمْ رَبُّھُمْ، اور ان کا لفظی ترجمہ صرف یہ ہے کہ "لے رہے ہوں گے جو کچھ اُن کے رب نے اُن کو دیا ہوگا" لیکن موقع و محل کی مناسبت سے اِس جگہ "لینے" کا مطلب محض "لینا" نہیں بلکہ خوشی خوشی لینا ہے، جیسے کچھ لوگوں کو ایک سخی داتا مٹھیاں بھر بھر کر انعام دے رہا ہو اور وہ لپک لپک کر اسے لے رہے ہوں۔ جب کسی شخص کو اس کی پسند کی چیز دی جائے تو اس لینے میں آپ سے آپ بخوشی قبول کرنے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ (التوبہ-۱۰۴)۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات لیتا ہے" اس جگہ صدقات لینے سے مراد محض ان کو وصول کرنا نہیں بلکہ پسندیدگی کے ساتھ ان کو قبول کرنا ہے۔

۱۵؎ مفسرین کے ایک گروہ نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات بھر سو کر گزار دیں اور اس کا کچھ نہ کچھ حصّہ، کم یا زیادہ، ابتدائے شب میں یا وسطِ شب میں یا آخرِ شب میں، جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف نہ کریں۔ یہ تفسیر تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرات ابن عباس، انس بن مالک، محمد الباقر، مطرف بن عبداللہ، ابوالعالیہ، مجاہد، قتادہ، ربیع بن انس وغیرہم سے منقول ہے۔ دوسرے گروہ نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ وہ اپنی راتوں کا زیادہ حصّہ اللہ جل شانہٗ کی عبادت میں گزارتے تھے اور کم سوتے تھے۔ یہ قول حضرات حسن بصری، اَحنف بن قیس، اور ابن شہاب زُہری کا ہے، اور بعد کے مفسرین و مترجمین نے اسی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ آیت کے الفاظ اور موقع و محل کے لحاظ سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔ اِسی لیے ہم نے ترجمے میں یہی معنی اختیار کیے ہیں۔

۱۶؎ یعنی وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو اپنی راتیں فسق و فجور اور فواحش میں گزارتے رہے اور پھر بھی کسی استغفار کا خیال تک اُنہیں نہیں آیا۔ اس کے برعکس ان کا حال یہ تھا کہ رات کا اچھا خاصا حصّہ عبادتِ الٰہی میں صرف کر دیتے تھے اور پھر بھی پچھلے پہروں میں اپنے رب کے حضور معافی مانگتے تھے کہ آپ کی بندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور محروم کے لیے۔[۱۷]

کا جو حق مجھ پر تھا، اس کے ادا کرنے میں ہم سے تقصیر ہوتی۔ هُمۡ يَسۡتَغۡفِرُوۡنَ کے الفاظ میں ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی نکلتا ہے کہ یہ روش انہی کو زیبا تھی۔ وہی اس شانِ عبودیت کے اہل تھے کہ اپنے رب کی بندگی میں جان بھی لڑائیں اور پھر اُس پر پھولنے اور اپنی نیکی پر فخر کرنے کے بجائے گڑگڑا کر اپنی کوتاہیوں کی معافی بھی مانگیں۔ یہ اُن بے شرم گناہ گاروں کا رویّہ نہ ہو سکتا تھا جو گناہ بھی کرتے تھے اور اوپر سے اکڑتے بھی تھے۔

[۱۷] بالفاظِ دیگر، ایک طرف اپنے رب کا حق وہ اِس طرح پہچانتے اور ادا کرتے تھے، دوسری طرف بندوں کے ساتھ اُن کا معاملہ یہ تھا۔ جو کچھ بھی اللہ نے ان کو دیا تھا، خواہ تھوڑا یا بہت، اُس میں وہ صرف اپنا اور اپنے بال بچوں ہی کا حق نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اُن کو یہ احساس تھا کہ ہمارے اس مال میں ہر اُس بندۂ خدا کا حق ہے جو ہماری مدد کا محتاج ہو۔ وہ بندوں کی مدد خیرات کے طور پر نہیں کرتے تھے کہ اُس پر اُن سے شکریہ کے طالب ہوتے اور اُن کو اپنا زیرِ بارِ احسان ٹھیراتے، بلکہ وہ اِسے اُن کا حق سمجھتے تھے اور اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ پھر اُن کی یہ خدمتِ خلق صرف اُنہی لوگوں تک محدود نہ تھی جو خود سائل بن کر اُن کے پاس مدد مانگنے کے لیے آتے، بلکہ جس کے متعلق بھی ان کے علم میں یہ بات آجاتی تھی کہ وہ اپنی روزی پانے سے محروم ہو گیا ہے اس کی مدد کے لیے وہ خود بےچین ہو جاتے تھے۔ کوئی یتیم بچہ جو بےسہارا رہ گیا ہو، کوئی بیوہ جس کا کوئی سر دھرا نہ ہو، کوئی معذور جو اپنی روزی کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مار سکتا ہو، کوئی شخص جس کا روزگار چھوٹ گیا ہو یا جس کی کمائی اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو رہی ہو، کوئی شخص جو کسی آفت کا شکار ہو گیا ہو اور اپنے نقصان کی تلافی خود نہ کر سکتا ہو، غرض کوئی حاجت مند ایسا نہ تھا جس کی حالت ان کے علم میں آئی ہو اور وہ اس کی دستگیری کر سکتے ہوں، اور پھر بھی انہوں نے اس کا حق مان کر اس کی مدد کرنے سے دریغ کیا ہو۔

یہ تین صفات ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ ان کو متقی اور محسن قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ انہی صفات نے ان کو جنّت کا مستحق بنایا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت پر ایمان لا کر انہوں نے ہر اُس روش سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے[۱۸]، اور خود تمہارے اپنے وجود

پرہیز کیا جسے اللہ اور اس کے رسول نے اُخروی زندگی کے لیے تباہ کن بتایا تھا۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے اللہ کی بندگی کا حق اپنی جان لڑا کر ادا کیا اور اُس پر فخر کرنے کے بجائے استغفار ہی کرتے رہے۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے اللہ کے بندوں کی خدمت اُن پر احسان سمجھ کر نہیں بلکہ اپنا فرض اور اُن کا حق سمجھ کر کی۔

اس مقام پر یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ اہلِ ایمان کے اموال میں سائل اور محروم کے جس حق کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اُس سے مراد زکوٰۃ نہیں ہے جسے شرعاً اُن پر فرض کر دیا گیا ہے، بلکہ یہ وہ حق ہے جو زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی ایک صاحبِ استطاعت مومن اپنے مال میں خود محسوس کرتا ہے اور اپنے دل کی رغبت سے اس کو ادا کرتا ہے بغیر اس کے کہ شریعت نے اسے لازم کیا ہو۔ ابن عباسؓ، مجاہد اور زید بن اسلم وغیرہ بزرگوں نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ درحقیقت اِس ارشادِ الٰہی کی اصل روح یہ ہے کہ ایک متقی و محسن انسان کبھی اِس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا کہ خدا اور اس کے بندوں کا جو حق میرے مال میں تھا، زکوٰۃ ادا کر کے مَیں اُس سے بالکل سبکدوش ہو چکا ہوں، اب مَیں نے اس بات کا کوئی ٹھیکہ نہیں لے لیا ہے کہ ہر ننگے، بھوکے، مصیبت زدہ آدمی کی مدد کرتا پھروں۔ اس کے برعکس جو اللہ کا بندہ واقعی متقی و محسن ہوتا ہے وہ ہر وقت ہر اُس بھلائی کے لیے جو اُس کے بس میں ہو، دل و جان سے تیار رہتا ہے اور جو موقع بھی اسے دنیا میں کوئی نیک کام کرنے کے لیے ملے اُسے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اُس کے سوچنے کا یہ انداز ہی نہیں ہوتا کہ جو نیکی مجھ پر فرض کی گئی تھی وہ میں کر چکا ہوں، اب مزید نیکی کیوں کروں۔ نیکی کی قدر جو شخص پہچان چکا ہو وہ اسے بار سمجھ کر برداشت نہیں کرتا بلکہ اپنے ہی نفع کا سودا سمجھ کر زیادہ سے زیادہ کمانے کا حریص ہو جاتا ہے۔

۱۸؎ نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو آخرت کے امکان اور اس کے وجوب و لزوم کی شہادت دے رہی ہیں۔ زمین کا اپنا وجود اور اس کی ساخت، اس کا سورج سے ایک خاص فاصلے پر اور ایک خاص زاویے پر رکھا جانا، اُس پر حرارت اور روشنی کا انتظام، اُس پر مختلف موسموں کی آمد و رفت، اس کے اُوپر ہوا اور پانی کی فراہمی، اس کے پیٹ میں طرح طرح کے بے شمار خزانوں کا مہیا کیا جانا، اس کی سطح پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہیں؟ ۱۹ کیا تم کو سوجھتا نہیں ؟ آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے

ایک زرخیز چھلکا چڑھایا جانا، اس میں قسم قسم کی بے حد و حساب نباتات کا اُگایا جانا، اُس کے اندر خشکی اور تری اور ہوا کے جانوروں کی بے شمار نسلیں جاری کرنا، اس میں ہر نوع کی زندگی کے لیے مناسب حالات اور موزوں خوراک کا انتظام کرنا، اُس پر انسان کو وجود میں لانے سے پہلے وہ تمام ذرائع و وسائل فراہم کر دینا جو تاریخ کے ہر مرحلے میں اس کی روز افزوں ضروریات ہی کا نہیں بلکہ اس کی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا ساتھ بھی دیتے چلے جائیں، یہ اور دوسری اَن گنت نشانیاں ایسی ہیں کہ دیدۂ بینا رکھنے والا جس طرف بھی زمین اور اس کے ماحول میں نگاہ ڈالے وہ اس کا دامنِ دل کھینچ لیتی ہیں۔ جو شخص یقین کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کر چکا ہو اس کی بات تو دوسری ہے۔ وہ ان میں اور سب کچھ دیکھ لے گا، بس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی نشانی ہی نہ دیکھے گا۔ مگر جس کا دل تعصب سے پاک اور سچائی کے لیے کھلا ہوا ہے وہ ان چیزوں کو دیکھ کر ہرگز یہ تصور قائم نہ کرے گا کہ یہ سب کچھ کسی اتفاقی دھماکے کا نتیجہ ہے جو کئی ارب سال پہلے کائنات میں اچانک برپا ہوا تھا، بلکہ اسے یقین آجائے گا کہ یہ کمال درجے کی حکیمانہ صنعت ضرور ایک قادرِ مطلق اور دانا و بینا خدا کی تخلیق ہے، اور وہ خدا جس نے یہ زمین بنائی ہے نہ اِس بات سے عاجز ہو سکتا ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کر دے، اور نہ ایسا نادان ہو سکتا ہے کہ اپنی زمین میں عقل و شعور رکھنے والی ایک مخلوق کو اختیارات دے کر بے نتھے بیل کی طرح چھوڑ دے۔ اختیارات کا دیا جانا آپ سے آپ محاسبے کا تقاضا کرتا ہے جو اگر نہ ہو تو حکمت اور انصاف کے خلاف ہو گا۔ اور قدرتِ مطلقہ کا پایا جانا خود بخود اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کا کام ختم ہونے کے بعد اس کا خالق جب چاہے محاسبے کے لیے اس کے تمام افراد کو زمین کے ہر گوشے سے، جہاں بھی وہ مرے پڑے ہوں، اٹھا کر لا سکتا ہے۔

۱۹؎ یعنی باہر دیکھنے کی بھی حاجت نہیں، خود اپنے اندر دیکھو تو تمہیں اِسی حقیقت پر گواہی دینے والی بے شمار نشانیاں مل جائیں گی۔ کس طرح ایک خوردبینی کیڑے اور ایسے ہی ایک خوردبینی انڈے کو ملا کر ماں کے ایک گوشۂ جسم میں تمہاری تخلیق کی بنا ڈالی گئی۔ کس طرح تمہیں اُس تاریک گوشے میں پرورش کر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وعدہ کیا جا رہا ہے۔ پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی، یہ بات حق ہے، ایسی ہی یقینی

تدریج بڑھایا گیا۔ کس طرح تمہیں ایک بے نظیر ساخت کا جسم اور حیرت انگیز قوتوں سے مالا مال نفس عطا کیا گیا۔ کس طرح تمہاری بناوٹ کی تکمیل ہوتے ہی شکمِ مادر کی تنگ و تاریک دنیا سے نکال کر تمہیں اس وسیع و عریض دنیا میں اس شان کے ساتھ لایا گیا کہ ایک زبردست خودکار مشین تمہارے اندر نصب ہے جو روزِ پیدائش سے جوانی اور بڑھاپے تک سانس لینے، غذا ہضم کرنے، خون بنانے اور رگ رگ میں اس کو دوڑانے، فضلات خارج کرنے، تحلیل شدہ اجزائے جسم کی جگہ دوسرے اجزاء تیار کرنے، اور اندر سے پیدا ہونے والی یا باہر سے آنے والی آفات کا مقابلہ کرنے اور نقصانات کی تلافی کرنے، حتیٰ کہ تھکاوٹ کے بعد تمہیں آرام کے لیے سُلا دینے تک کا کام خود بخود کیے جاتی ہے بغیر اس کے کہ تمہاری توجہات اور کوششوں کا کوئی حصہ زندگی کی اِن بنیادی ضروریات پر صرف ہو۔ ایک عجیب دماغ تمہارے کاسۂ سر میں رکھ دیا گیا ہے جس کی پیچیدہ تہوں میں عقل، فکر، تخیّل، شعور، تمیز، ارادہ، حافظہ، خواہش، احساسات و جذبات، میلانات و رجحانات، اور دوسری ذہنی قوتوں کی ایک انمول دولت بھری پڑی ہے۔ بہت سے ذرائعِ علم تم کو دیئے گئے ہیں جو آنکھ، ناک، کان اور پُورے جسم کی کھال سے تم کو ہر نوعیت کی اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ زبان اور گویائی کی طاقت تم کو دے دی گئی ہے جس کے ذریعہ سے تم اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتے ہو۔ اور پھر تمہارے وجود کی اس پُوری سلطنت پر تمہاری اَنا کو ایک رئیس بنا کر بٹھا دیا گیا ہے کہ ان تمام قوتوں سے کام لے کر رائیں قائم کرو اور یہ فیصلہ کرو کہ تمہیں کن راہوں میں اپنے اوقات، محنتوں اور کوششوں کو صرف کرنا ہے، کیا چیز رد کرنی ہے اور کیا قبول کرنی ہے، کس چیز کو اپنا مقصود بنانا ہے اور کس کو نہیں بنانا۔

یہ ہستی بنا کر جب تمہیں دنیا میں لایا گیا تو ذرا دیکھو کہ یہاں آتے ہی کتنا سروسامان تمہاری پرورش، نشوونما، اور ترقی و تکمیلِ ذات کے لیے تیار تھا جس کی بدولت تم زندگی کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر اپنے اِن اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل ہو گئے۔

ان اختیارات کو استعمال کرنے کے لیے زمین میں تم کو ذرائع دیئے گئے۔ مواقع فراہم کیے گئے۔ بہت سی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چیزوں پر تم کو تصرّف کی طاقت دی گئی۔ بہت سے انسانوں کے ساتھ تم نے طرح طرح کے معاملات کیے۔ تمہارے سامنے کفر و ایمان، فسق و طاعت، ظلم و انصاف، نیکی و بدی، حق و باطل کی تمام راہیں کھلی ہوئی تھیں اور ان راہوں میں سے ہر ایک کی طرف بلانے والے اور ہر ایک کی طرف لے جانے والے اسباب موجود تھے۔ تم میں سے جس نے جس راہ کو بھی انتخاب کیا اپنی ذمہ داری پر کیا، کیونکہ فیصلہ و انتخاب کی طاقت اُس کے اندر ودیعت تھی۔ ہر ایک کے اپنے ہی انتخاب کے مطابق اس کی نیتوں اور ارادوں کو عمل میں لانے کے جو مواقع اس کو حاصل ہوئے ان سے فائدہ اٹھا کر کوئی نیک بنا اور کوئی بد، کسی نے ایمان کی راہ اختیار کی اور کسی نے کفر و شرک یا دہریت کی راہ لی، کسی نے اپنے نفس کو ناجائز خواہشات سے روکا اور کوئی بندگیٔ نفس میں سب کچھ کر گزرا، کسی نے ظلم کیا اور کسی نے ظلم سہا، کسی نے حقوق ادا کیے اور کسی نے حقوق مارے، کسی نے مرتے دم تک دنیا میں بھلائی کی اور کوئی زندگی کی آخری ساعت تک بُرائیاں کرتا رہا، کسی نے حق کا بول بالا کرنے کے لیے جان لڑائی، اور کوئی باطل کو سربلند کرنے کے لیے اہلِ حق پر دست درازیاں کرتا رہا۔

اب کیا کوئی شخص جس کی ہیے کی آنکھیں بالکل ہی پھوٹ نہ گئی ہوں، یہ کہہ سکتا ہے کہ اس طرح کی ایک ہستی زمین پر اتفاقاً وجود میں آگئی ہے؟ کوئی حکمت اور کوئی منصوبہ اس کے پیچھے کارفرما نہیں ہے؟ زمین پر اس کے ہاتھوں یہ سارے ہنگامے جو برپا ہو رہے ہیں سب بے مقصد ہیں اور بے نتیجہ ہی ختم ہو جانے والے ہیں؟ کسی بھلائی کا کوئی ثمرہ اور کسی بدی کا کوئی پھل نہیں؟ کسی ظلم کی کوئی داد اور کسی ظالم کی کوئی باز پرس نہیں؟ اس طرح کی باتیں ایک عقل کا اندھا تو کہہ سکتا ہے، یا پھر وہ شخص کہہ سکتا ہے جو پہلے سے قسم کھائے بیٹھا ہے کہ تخلیق انسان کے پیچھے کسی حکیم کی حکمت کو نہیں ماننا ہے۔ مگر ایک غیر متعصب صاحبِ عقل آدمی یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان کو جس طرح، جن قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ اس دنیا میں پیدا کیا گیا ہے اور جو حیثیت اس کو یہاں دی گئی ہے وہ یقیناً ایک بہت بڑا حکیمانہ منصوبہ ہے، اور جس خدا کا یہ منصوبہ ہے، اُس کی حکمت لازماً یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی باز پرس ہو، اور اس کی قدرت کے بارے میں یہ گمان کرنا ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ جس انسان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیسے تم بول رہے ہو۔

اے نبی، ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے[۲۱]؟ جب وہ اُس کے

وہ ایک خوردبینی خلیے سے شروع کر کے اس مرتبے تک پہنچا چکا ہے اسے پھر وجود میں نہ لاسکے گا۔

۲۰؎ آسمان سے مراد یہاں عالمِ بالا ہے۔ رزق سے مراد وہ سب کچھ ہے جو دنیا میں انسان کو جینے اور کام کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اور مَا تُوْعَدُوْنَ سے مراد قیامت، حشر و نشر، محاسبہ و بازپرس، جزا و سزا، اور جنت و دوزخ ہیں جن کے رونما ہونے کا وعدہ تمام کتبِ آسمانی میں اور اس قرآن میں کیا جاتا رہا ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ بالا ہی سے یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ تم میں سے کس کو کیا کچھ دنیا میں دیا جائے، اور وہیں سے یہ فیصلہ بھی ہونا ہے کہ تمہیں بازپرس اور جزائے اعمال کے لیے کب بلایا جائے۔

۲۱؎ اب یہاں سے رکوعِ دوم کے اختتام تک انبیاء علیہم السلام اور بعض گزشتہ قوموں کے انجام کی طرف پے در پے مختصر اشارات کیے گئے ہیں جن سے دو باتیں ذہن نشین کرانی مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ انسانی تاریخ میں خدا کا قانونِ مکافات برابر کام کرتا رہا ہے جس میں نیکو کاروں کے لیے انعام اور ظالموں کے لیے سزا کی مثالیں مسلسل پائی جاتی ہیں۔ یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ دنیا کی اس زندگی میں بھی انسان کے ساتھ اس کے خالق کا معاملہ صرف قوانینِ طبیعی (PHYSICAL LAWS) پر مبنی نہیں ہے بلکہ اخلاقی قانون (MORAL LAW) اس کے ساتھ کارفرما ہے۔ اور جب سلطنتِ کائنات کا مزاج یہ ہے کہ جس مخلوق کو جسمِ طبیعی میں رہ کر اخلاقی اعمال کا موقع دیا گیا ہو، اس کے ساتھ حیوانات و نباتات کی طرح محض طبیعی قوانین پر معاملہ نہ کیا جائے، بلکہ اس کے اخلاقی اعمال پر اخلاقی قانون بھی نافذ کیا جائے، تو یہ بات بجائے خود اس حقیقت کی صاف نشاندہی کرتی ہے کہ اس سلطنت میں ایک وقت ایسا ضرور آنا چاہیے جب اس طبیعی دنیا میں انسان کا کام ختم ہو جانے کے بعد خالص اخلاقی قانون کے مطابق اس کے اخلاقی اعمال کے نتائج پوری طرح برآمد ہوں کیونکہ اس طبیعی دنیا میں وہ مکمل طور پر برآمد نہیں ہو سکتے۔ دوسری بات جو ان تاریخی اشارات سے ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جن قوموں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاں آئے تو کہا آپ کو سلام ہے۔ اُس نے کہا "آپ لوگوں کو بھی سلام ہے ــــ کچھ نا آشنا سے لوگ ہیں۲۳" پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا۲۴ اور ایک موٹا تازہ بچھڑا۲۵ لا کر مہمانوں

بھی انبیاء علیہم السلام کی بات نہ مانی اور اپنی زندگی کا پورا رویّہ توحید، رسالت اور آخرت کے انکار پر قائم کیا وہ آخرکار ہلاکت کی مستحق ہو کر رہیں۔ تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا کا قانونِ اخلاق جو انبیاء کے ذریعہ سے دیا گیا، اور اس کے مطابق انسانی اعمال کی بازپرس جو آخرت میں ہونی ہے، سراسر مبنی بر حقیقت ہے، کیونکہ جس قوم نے بھی اس قانون سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھتے ہوئے دنیا میں اپنا رویّہ متعین کیا ہے وہ آخرکار سیدھی تباہی کی طرف گئی ہے۔

۲۲؎ یہ قصّہ قرآن مجید میں تین مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۳۵۳ تا ۳۵۵، ۵۰۹ تا ۵۱۱۔ جلد سوم، ص ۶۹۶۔

۲۳؎ سیاق و سباق کو دیکھتے ہوئے اس فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود ان مہمانوں سے فرمایا کہ آپ حضرات سے کبھی پہلے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہُوا، آپ شاید اس علاقے میں نئے نئے تشریف لائے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے سلام کا جواب دے کر حضرت ابراہیم نے اپنے دل میں کہا، یا گھر میں ضیافت کا انتظام کرنے کے لیے جاتے ہوئے اپنے خادموں سے فرمایا کہ یہ کچھ اجنبی سے لوگ ہیں، پہلے کبھی اس علاقے میں اِس شان اور وضع قطع کے لوگ دیکھنے میں نہیں آئے۔

۲۴؎ یعنی اپنے مہمانوں سے یہ نہیں کہا کہ مَیں آپ کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں بلکہ انہیں بٹھا کر خاموشی سے ضیافت کا انتظام کرنے چلے گئے تاکہ مہمان تکلفًا یہ نہ کہیں کہ اس تکلیف کی کیا حاجت ہے۔

۲۵؎ سورۂ ہود میں عِجْلٍ حَنِیْذٍ (بُھنے ہوئے بچھڑے) کے الفاظ ہیں۔ یہاں بتایا گیا کہ آپ نے خوب چھانٹ کر موٹا تازہ بچھڑا بُھنوایا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے آگے پیش کیا۔ اس نے کہا آپ حضرات کھاتے نہیں؟ پھر وہ اپنے دل میں ان سے ڈرا۔[۲۶] انہوں نے کہا ڈریے نہیں، اور اسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا۔[۲۷] یہ سُن کر اُس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی، "بوڑھی، بانجھ!"[۲۸] انہوں نے کہا "یہی کچھ فرمایا ہے تیرے ربّ نے، وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"[۲۹]

---

۲۶ یعنی جب ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہ بڑھے تو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اس خوف کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اجنبی مسافروں کا کسی کے گھر جا کر کھانے سے پرہیز کرنا، قبائلی زندگی میں اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ وہ کسی بُرے ارادے سے آئے ہیں۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ اُن کے اس اجتناب ہی سے حضرت ابراہیم سمجھ گئے کہ یہ فرشتے ہیں جو انسانی صورت میں آئے ہیں، اور چونکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا بڑے غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے اس لیے آپ کو خوف لاحق ہوا کہ کوئی خوفناک معاملہ درپیش ہے جس کے لیے یہ حضرات اس شان سے تشریف لائے ہیں۔

۲۷ سورۂ ہود میں تصریح ہے کہ یہ حضرت اسحاق علیہ السّلام کی پیدائش کا مژدہ تھا، اور اس میں یہ بشارت بھی دی گئی تھی کہ حضرت اسحاق سے اُن کو حضرت یعقوب علیہ السّلام جیسا پوتا نصیب ہوگا۔

۲۸ یعنی ایک تو میں بوڑھی، اوپر سے بانجھ۔ اب میرے ہاں بچہ ہوگا؟ بائیبل کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیم کی عمر سو سال، اور حضرت سارہ کی عمر ۹۰ سال تھی (پیدائش، ۱۸ : ۱۷)

۲۹ اس قصے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس بندے نے اپنے رب کی بندگی کا حق دنیا میں ٹھیک ادا کیا تھا، اس کے ساتھ عقبیٰ میں تو جو معاملہ ہوگا سو ہوگا، اسی دنیا میں اُس کو یہ انعام دیا گیا کہ عام قوانینِ طبیعت کی رُو سے جس عمر میں اس کے ہاں اولاد پیدا نہ ہو سکتی تھی، اور اس کی سن رسیدہ بیوی تمام عمر بے اولاد رہ کر اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی، اُس وقت اللہ نے اسے نہ صرف اولاد دی بلکہ ایسی بے نظیر اولاد دی جو آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔ دنیا میں کوئی دوسرا انسان ایسا نہیں ہے جس کی نسل میں مسلسل چار انبیاء پیدا ہوئے ہوں۔ وہ صرف حضرت ابراہیم ہی تھے جن کے ہاں تین پشت تک نبوت چلتی رہی اور حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السّلام جیسے جلیل القدر نبی اُن کے گھرانے سے اُٹھے۔

© rasailojaraid.com